



نور فاطمہ

پی ایچ ڈی اسکالر، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔

ڈاکٹر نائلہ انجم

اسسٹنٹ پروفیسر، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔

اکیسویں صدی کا اردو افسانہ: ذہنی کرب کا بیان

Noor Fatima *

PhD scholar, Lahore College For Women University, Lahore.

Dr. Naila Anjum

Assistant Professor, Lahore College For Women University, Lahore.

*Corresponding Author:

21st Century Urdu Short Story: A Narrative of Psychological Anguish

The human of the twenty-first century appears on the surface to be a representative of progress, convenience, and a fast-paced life, yet his inner world seems more fragmented and restless than ever before. In this era of material success, loneliness, insecurity, social pressure, and relentless competition have profoundly affected the human mind. As a result, mental illnesses such as depression, anxiety, psychological confusion, identity crisis, and a sense of isolation are rapidly increasing, leaving deep imprints on human personality and behaviour. Urdu literature, and in particular the short story, has emerged as a deeply meaningful expression of this changing psychological condition. In the twenty-first century Urdu short story, characters are seen struggling not only with external circumstances but also with the internal collapse of their own inner selves. Short story writers, presenting the complexities of human consciousness, mental disorders, and inner conflict through symbolic and psychological narrative, acquaint the reader with the true reality of modern man. This research paper will examine the diverse aspects of

psychological anguish as portrayed in the twenty-first century Urdu short story.

Key Words: Urdu fiction, Mental health, 21st century, Urdu afsana, Psychological trauma, Mental disorders, Modern man, Trauma, Anxiety, Loneliness.

ادب محض الفاظ کا مرقع نہیں بلکہ انسانی تہذیب کا وہ آئینہ ہے جس میں ہر دور کی سچائیاں، کرب، خوشیاں اور ایسے اپنی پوری شدت کے ساتھ منعکس ہوتے ہیں۔ جب تاریخ خاموش ہو جاتی ہے، جب سماجی علوم کی زبان بے اثر ہو جاتی ہے، تب ادب اپنی حساس انگلیوں سے انسانی روح کی نبض کو محسوس کرتا ہے اور اسے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ بھی اسی روایت کا امین ہے، جو اپنے عہد کی پیچیدگیوں، تضادات اور خاص طور پر ذہنی کرب کی داستان بیان کرتا ہے۔

ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے عہد کی سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی کیفیات کا عکاس ہوتا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں اٹھارہویں صدی کی دہلی کا زوال، غالب کے کلام میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد کا ذہنی اضطراب، پریم چند کے افسانوں میں نوآبادیاتی دور کا استحصال اور منٹو کی کہانیوں میں تقسیم ہند کی خونیں داستانیں یہ سب اس بات کی مثالیں ہیں کہ ادب کس طرح اپنے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ ادب کی یہ خصوصیت محض تاریخی واقعات کی عکاسی تک محدود نہیں بلکہ یہ انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ جب معاشرہ تبدیل ہوتا ہے تو انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات بھی بدلتی ہیں۔ صنعتی انقلاب نے جہاں مادی ترقی دی، وہیں انسان کو مشین کا پرزہ بنا دیا۔ جدیدیت نے روایتی اقدار کو چیلنج کیا تو انسان شناخت کے بحران میں مبتلا ہو گیا۔ مابعد جدیدیت نے حقیقت کے تصور کو ہی سوالیہ نشان بنا دیا تو انسان کی ذہنی الجھنیں مزید بڑھ گئیں۔ اردو ادب نے بھی ہر دور میں اپنے معاشرے کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال کو جبکہ جدیدیت نے انسان کی تنہائی اور بیگانگی کو موضوع بنایا۔ اکیسویں صدی کا ادب ایک ایسے دور کی عکاسی کر رہا ہے جہاں ٹیکنالوجی کی ترقی، عالمگیریت، سماجی رشتوں کی شکست و ریخت اور تیز رفتار زندگی نے انسان کو ایک نئے قسم کے بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ بحران جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے، جو ذہنی دباؤ، اضطراب، افسردگی اور تنہائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اردو ادب کی مختلف اصناف میں افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو انسانی نفسیات کی باریکیوں کو بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتی ہے۔ افسانے کی مختصر ہیئت، مرکوز پلاٹ اور کردار نگاری کی گہرائی اسے نفسیاتی موضوعات

کے لیے موزوں ترین صنف بناتی ہے۔ جہاں ناول میں وسعت ہوتی ہے، وہیں افسانہ شدت اور تاثیر کا حامل ہوتا ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پریم چند سے لے کر منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور بلراج مینز تک ہر دور کے افسانہ نگاروں نے انسانی نفسیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں تقسیم کے نفسیاتی اثرات، بیدی کے کرداروں کی داخلی کشش اور انتظار حسین کے افسانوں میں وقت اور یادوں کی نفسیات یہ سب اس بات کی مثالیں ہیں کہ اردو افسانہ ہمیشہ سے انسانی ذہن کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور بیان کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اکیسویں صدی میں آکر یہ رجحان مزید گہرا ہوا ہے۔ آج کا افسانہ نگار محض سماجی مسائل کو بیان نہیں کرتا بلکہ ان مسائل کے نفسیاتی اثرات کو بھی موضوع بناتا ہے۔ غربت، بے روزگاری، عدم تحفظ، تشدد یہ سب محض واقعات نہیں بلکہ ذہنی صحت پر گہرے اثرات ڈالنے والے عوامل ہیں اور آج کا افسانہ نگار ان اثرات کو بیان کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ابو الکلام قاسمی لکھتے ہیں:

”نفسیاتی تنقید کے زیر اثر بعض عالمگیر عوامل مثلاً جنس بعض
نفسیاتی الجھن مثلاً ایڈی پس کمپلیکس، احساس کمتری بعض
نفسیاتی گمراہیاں، مثلاً ایڈاپٹیشن یا ایڈاپٹیشن پرستی وغیرہ ایسی
چیزیں ہیں جن کے مظاہر ادب میں بالعموم نظر آنے لگے
ہیں۔“^(۱)

عالمی ادارہ صحت کے مطابق اکیسویں صدی میں ذہنی بیماریاں انسانیت کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن چکی ہیں۔ ڈپریشن (Depression)، اضطراب (Anxiety)، دوہری شخصیت (bipolar disorder)، شیڈ فرینیا (Schizophrenia) اور دیگر نفسیاتی عوارض تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ یہ صرف مغربی معاشروں کا مسئلہ نہیں بلکہ جنوبی ایشیا، بشمول پاکستان اور ہندوستان، میں بھی ذہنی صحت کے مسائل خطرناک حد تک بڑھ رہے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں یہ صورتحال مزید سنگین ہے۔ اکیسویں صدی کو اگر “ذہنی صحت کے بحران کا دور” کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اکیسویں صدی میں ذہنی بیماریوں میں اضافے کی متعدد وجوہات ہیں:

۱. ٹیکنالوجی کا دباؤ: انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل دنیا نے زندگی کو تیز تر بنا دیا ہے۔ مسلسل رابطے میں رہنے کا دباؤ، آن لائن موجودگی کی ضرورت اور ہر ٹرینڈ سے واقف ہونے کی خواہش نے ذہنی دباؤ میں اضافہ کیا

ہے۔ دراصل سوشل میڈیا نے مصنوعی زندگی کا ایک ایسا جال بنا دیا ہے جہاں ہر شخص دوسرے سے بہتر نظر آنے کی کوشش میں اپنی اصل شناخت کھو بیٹھا ہے۔

۲. معاشی عدم تحفظ: بے روزگاری، مہنگائی، اور مسابقت کی دوڑ نے نوجوان نسل کو شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا ہے۔ عالمگیریت (Globalization) نے جہاں مواقع پیدا کیے ہیں وہیں مقابلہ بھی بڑھایا ہے۔ ملازمت کا عدم استحکام، مہنگائی اور معاشی عدم مساوات نے لوگوں میں مستقبل کے بارے میں خوف پیدا کیا ہے۔

۳. سماجی تعلقات کی کمزوری: جوائنٹ فیملی سسٹم کا خاتمہ، شہری زندگی کی تنہائی اور حقیقی انسانی تعلقات کی کمی نے لوگوں کو جذباتی سہارے سے محروم کر دیا ہے۔

۴. سیاسی اور سماجی عدم استحکام: دہشت گردی، فرقہ واریت، سیاسی انتشار اور قانون کی حکمرانی کی کمی نے معاشرے میں خوف اور عدم تحفظ کا ماحول پیدا کیا ہے۔

۵. اقدار کا زوال: روایتی اقدار اور جدید طرز زندگی کے درمیان تصادم نے خاص طور پر نوجوان نسل میں شناخت کا بحران پیدا کیا ہے۔

۶. کورونا وبا کے اثرات: COVID-19 کی وبائے عالمی سطح پر ذہنی صحت کے مسائل میں بے پناہ اضافہ کیا۔ لاک ڈاؤن، سماجی دوری، اموات کا خوف اور معاشی بحران نے لاکھوں لوگوں کو ڈپریشن اور اضطراب کا شکار بنایا۔

ان تمام عوامل نے مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جہاں ذہنی کرب، اضطراب اور افسردگی عام ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے جدید اردو افسانہ اپنے اندر سمور ہا ہے۔ معاصر افسانہ نگاروں نے ذہنی کرب کو بیان کرنے کے لیے مختلف ادبی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے شعوری بہاؤ (Stream of Consciousness) کی تکنیک استعمال کی ہے تاکہ کردار کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو براہ راست پیش کیا جاسکے۔ یہ تکنیک خاص طور پر اضطراب اور افسردگی کی کیفیات کو بیان کرنے میں مؤثر ہے۔ ذہنی بیماریوں کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے بہت سے افسانہ نگاروں نے علامتوں (Symbolism) کا سہارا لیا ہے۔ تاریکی، بند کمرے، ٹوٹے ہوئے شیشے اور خاموشی جیسی علامتیں ذہنی کرب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ذہنی بیماریوں میں مبتلا کرداروں کی کہانیاں اکثر غیر خطی انداز (Non-linear Narrative) میں بیان کی جاتی ہیں، جہاں ماضی اور حال آپس میں گڈھ ہو جاتے ہیں۔ یہ تکنیک کردار کی ذہنی انتشار کی عکاسی کرتی ہے۔ بہت سے افسانوں میں کردار خود

سے بات کرتے ہیں، اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں اور اپنے وجود پر شک کرتے ہیں۔ یہ داخلی مکالمہ (Internal Dialogue) نفسیاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں موضوعاتی سطح پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آج کا افسانہ نگار محض کہانی نہیں سناتا بلکہ انسانی ذہن کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان خاموش چیزوں کو الفاظ دے دیتا ہے جو سماج کے شور میں دب جاتی ہیں۔ اس دور کا افسانہ نگار عالمی ادب سے متاثر ہے، نفسیاتی حقیقت نگاری سے واقف ہے اور جدید انسان کے داخلی بحر ان کو سمجھتا ہے۔ پروفیسر صغیر افرامیم کے مطابق:

”آج کے افسانہ میں احساس ہوتا ہے کہ انسان کی کھوکھلی شخصیت جو محض نمائشی کروفر کی چیز بن گئی ہے، برق رفتار دور میں داخل ہو کر اور بھی پراسرار بن گئی ہے۔ تشنہ آرزوؤں، نفسانی خواہشوں اور جنسی بے راہ روی نے اخلاقی پستی کے کچھ اور بھی دروازے کھول دیے ہیں۔ شہری زندگی میں کاہلی، بیکاری، فاقہ، مستی، بددیانتی، بے سروسامانی اور رشوت ستانی نے ذہن اور ضمیر کی رسہ کشی کو تیز کر دیا ہے۔ محدود ذرائع آمدنی سے شکوک میں اضافہ ہوا تو بے نیازی، بے اعتباری اور بے وفائی کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ کرب و یاس کے اس ماحول نے عوام کو ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے، جس کی بنا پر اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ فن بھی بدلا ہے اور مطمح نظر کے زاویے بھی تبدیل ہوئے ہیں۔“^(۲)

ادبی تناظر میں خود کشی کو اکثر انسانی کرب، تنہائی اور داخلی ٹھکست کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عمل کسی ایک لمحے کا فیصلہ نہیں بلکہ مسلسل نفسیاتی دباؤ، ناامیدی اور سماجی بے حسی کا نتیجہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ادب میں خود کشی زندگی سے فرار نہیں بلکہ ایسے نظام اور رویوں پر ایک خاموش الزام ہوتی ہے جو انسان کو سنسنے اور سہارا دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ محمد حمید شاہد کا افسانہ ”باقی عمر اضافی ہے“ انفرادی اور اجتماعی سانحے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے کا کردار اپنی زندگی سے بیزار ہے اور خود کشی کے خواب بتاتا ہے۔ زندگی خوشی اور غم سے مزین

ہے۔ بعض اوقات انسان غموں سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود کشی کرنے اور چھت سے تریوز پھینکنے والے واقعہ کو آپس میں گڈ مڈ کر دیتا ہے اور تصور کر لیتا ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے دکھوں، کرب اور درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے کھڑکی سے چھلانگ لگائے گا تو اس کا دماغ بھی تریوز کی طرح فرش پر بکھر جائے گا جو ناظرین کے لیے باعث عبرت ہو گا۔ اس کی ذات کا غم اور تکلیف دوسروں کے ساتھ آنے والے واقعات کے لیے ڈھارس بن جائے گا۔ گویا سانحہ جو انفرادی تھا، اجتماعی روپ دھار لے گا:

”اچانک حواس پر چڑھ دوڑنے والے خوف اور تجسس میں
گندھی ہوئی حیرت کی آوازیں باہر کو ریڈور سے اندر رس
رس کر آنے لگی تھیں۔ میں متعجب ہوا؛ ہائیں، تو کیا باہر کی
آوازیں بھی اندر آتی رہی تھیں، شاید ہمیشہ سے۔ میں ناحق
متعجب ہو رہا تھا؛ یقیناً آوازیں آتی رہی ہوں گی اندر، بس میں
ہی دھیان نہ دیتا رہا تھا۔“ (۳)

نیر اقبال علوی نے اپنے افسانے "خارش زدہ کتا" میں شہر کی زبوں حالی کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہوئے دراصل معاشرے میں رائج عدم برداشت، خوف، سماجی بے حسی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے نتیجے میں جنم لینے والے نفسیاتی مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ افسانہ نگار نے معمولی اور بظاہر چھوٹے واقعات کے ذریعے اکیسویں صدی میں در آنے والی سماجی برائیوں اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنی الجھنوں، اضطراب اور خوف کی نہایت مؤثر عکاسی کی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دہشت گردی کو مذہب کے ساتھ منسوب کر کے ایک خاص ظاہری شناخت قائم کی گئی، جس کے باعث مذہب اور مذہب حلیے سے وابستہ افراد کو مشکوک اور خوف کی علامت سمجھا جانے لگا۔ مزید برآں عبادت گاہوں پر بم دھماکوں جیسے واقعات نے معاشرے میں عدم تحفظ اور ذہنی خوف کو کئی گنا بڑھا دیا حالانکہ مذہب انسان کو ذہنی سکون اور روحانی آسودگی فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے:

”مسجدوں کے میناروں سے گونجنے والی اذانوں میں
قدرت نے ان کے لیے جو ولولہ انگیز پیغام رکھا تھا
اس کو سراسر فراموش کر بیٹھے اس بے لگام اور بے
نہار ہجوم نے انسانیت کی تمام اعلیٰ و ارفع اقدار،

سنہری روایات کو جاہلیت اور تنگ نظری کے پیروں
تے روند ڈالا ہے۔“^(۴)

محمد حمید شاہد کا افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" نائن الیون کے بعد بدلتی ہوئی دنیا کی فضا کو ایک مقامی منظر نامے میں سمو دیتا ہے۔ کہانی کچلاک جیسے نسبتاً پرامن علاقے میں اچانک سرایت کر جانے والے خوف کو نمایاں کرتی ہے۔ ۱۱/۹ کے بعد دہشت گردی کے خدشات نے عام انسان کی روزمرہ زندگی کو عدم تحفظ میں بدل دیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو تنگ کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ خاموشیاں با معنی ہو جاتی ہیں اور معمولی واقعات بھی خوف کی علامت بن جاتے ہیں۔ فضا میں ہر وقت گرفتاری، تلاشی اور کسی انہونی کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ انسانی رشتوں میں اعتماد کمزور پڑ جاتا ہے۔ دہشت گردی صرف جسمانی تباہی نہیں بلکہ ذہنی اذیت بھی ہے:

”پہلے وہاں سیکیورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کرتا تھا مگر جب
سے امریکہ میں نائن الیون والا حادثہ ہوا اور ٹورنٹو سے دو
جہاز ٹکرائے اور بدلے میں امریکہ نے عراق اور بعد ازاں
افغانستان پر چڑھائی کی تھی، ادھر پاکستان کے ہر شہر میں
سیکیورٹی کا سامان بیچنے والوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ خیر، کہیں
کہیں تو واقعی ایسے اقدامات کی ضرورت تھی کہ دہشت
گردوں کی کارروائی سے بچا جاسکے۔ بہ طور خاص امریکی
ڈرونز کے ختم ہونے والے سلسلے نے دہشت کی ایسی فضا کو
جنم دیا تھا کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“^(۵)

ڈر، خوف، دہشت اور گھبراہٹ کی کیفیات بھی بعض اوقات خاص ذہنی حالت کی وجہ سے انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ وہ انسانوں و اہموں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے چیزیں ٹوٹی، بکھرتی اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اساطیری کرداروں مافوق الفطرت عناصر سے ہم کلام ہوتا ہے اور ذہنی طور پر دوسرے لوگوں سے مختلف ایک حالت میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ یہی مخصوص ذہنی حالت ہمیں خالد سعید کے افسانوی کرداروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ سنبل کے درخت اور ایک لڑکی کی محبت کی داستان بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ افسانہ "پریم کتھا ایک سنبل کی" سے یہ اقتباس دیکھیے:

”اسی طرح ہم چلتے چلتے لارنس تک آ پہنچے باغ میں ایک وحشی
افسردگی ناچ رہی تھی۔ خشک پتوں کی چر مراہٹ میں چلتے ہوئے
ہم اس پرانے سنبل کے قریب آ کر ٹھہر گئے۔ یکایک تیز ہوا چلنے
لگی مر جھائے ہوئے خشک پتے زمین سے اڑ کر پیڑوں پر لگنے لگے،
وہ سنبل کے تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ بجلی کڑکی اور اندھیرا چھا
گیا یا خدا خیر یہ بے موسمی برسات سہم سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ سنہم
کی گنجیل دار شاخیں لرز رہی تھیں۔ بجلی کی چمک کی روشنی میں
نے دیکھا کہ سرخ پھولوں نے عازہ کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ سنبل
کے تنے اور شاخوں میں حرکت ہوئی وہ ایک دوسرے سے لپٹ
گئے اور پھر بتدریج ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔“ (۶)

شہری زندگی کے مسلسل دباؤ میں جیتا ہوا انسان اکثر حال سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اس کی توجہ مستقبل
کی بے یقینی یا ماضی کے بوجھ میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ کیفیت ذہنی ٹھکن، اضطراب اور احساس تنہائی کو
جنم دیتی ہے، جہاں فرد اپنی ذات اور جذبات سے کٹنے لگتا ہے۔ تیز رفتار معمولات، مقابلے کی فضا اور سماجی توقعات
انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں مگر وہ مسکراہٹ اوڑھ کر چلتا رہتا ہے۔ یوں شہری انسان بظاہر فعال مگر باطن میں
منشتر نظر آتا ہے، جو حال میں جینے کی صلاحیت کھوتا جا رہا ہے۔ عذرا عباس کا افسانہ ”سڑک پار کرنے سے پہلے“ ایک
شخص کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ افسانہ انسانی ذہن کی عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح پل بھر
میں ایک شخص کا ذہن پُر سکون اور اگلے ہی پل میں شور و غل کا مسکن بن سکتا ہے:

”اس کی عادت تھی۔ لمحوں میں پُر سکون ہو جاتا سب کچھ بھول کر
اور لمحوں میں سب کچھ یاد کر کے بے چین ہو جاتا۔ بہت کام ایک
ساتھ گٹھری بن کر اس کے سر پر وزن ڈال دیتے ہیں۔۔۔“ (۷)

عدم تحفظ کا احساس دراصل انسان کے باطن میں خارجی حالات کے اثر سے جنم لیتا ہے۔ عورتوں کے لیے
یہ کیفیت زیادہ تر پیدر سری سماجی ڈھانچے کی پیدا کردہ ہوتی ہے جب کہ مردوں میں یہ احساس اجتماعی انتشار، بے
روزگاری، بھوک اور معاشی بد حالی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مبین مرزا کے افسانے ”طلسمی دوڑ“ کا کردار بھی

محرومی، بھوک، افلاس اور غربت کے باعث شدید ذہنی دباؤ اور ڈپریشن کا شکار دکھائی دیتا ہے، جہاں وہ انسانوں کے اس بے رحم جنگل میں خود کو تنہا، کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہے:

”کبھی دوڑتے دوڑتے اُسے محسوس ہوتا کہ بری طرح ہانپنے لگا ہے۔۔۔ اتنی بُری طرح کہ اسے اپنے سینے سے ڈھونڈنے کی آواز سنائی دیتی۔ آنکھوں میں، ناک میں اور حلق سے پھیپھڑوں تک دھواں ہی دھواں بھر جاتا۔ کڑوا اور گاڑھا دھواں جس سے آدمی کا دم گھٹ جاتا ہے۔ سوچتا کہ اس کا بھی کچھ ہی لمحوں میں دم گھٹ جائے گا۔“^(۸)

شناخت کا بحران اکیسویں صدی کا ایک سنگین اور ہمہ گیر مسئلہ ہے، جس نے عالمی، قومی، مقامی، اجتماعی اور انفرادی ہر سطح پر انسان کو متاثر کیا ہے۔ اس بحران کی ابتدا فرد کی ذات سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ پورے وجود اور کائنات تک پھیل جاتی ہے۔ عالمی بالادستی، استعماریت اور نیو ورلڈ آرڈر جیسے تصورات نے شناخت کے اس مسئلے کو مزید گہرا کر دیا ہے جبکہ اکیسویں صدی کی تیز رفتار سماجی و تہذیبی تبدیلیوں نے بھی فرد کو شناخت کے بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ مبین مرزا کا افسانہ ”گم شدہ لوگ“ فردیت کی تلاش کے موضوع کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار، اسم بامسی رئیس، ہر ماہ کی آخری تاریخ کو طوائف انجلی کے ساتھ ہوٹل میں وقت گزارتا ہے۔ افسانے میں فرد کی ذاتی شناخت کی جستجو نمایاں ہے، جہاں رئیس ایسی داخلی پہچان کا متلاشی ہے جو آزادی پر مبنی ہو اور کسی مخصوص رشتے یا سماجی اصول و ضوابط کی پابند نہ ہو۔ اکیسویں صدی میں انسانوں کے جہوم میں فرد بار بار تقسیم ہوتا چلا گیا ہے اور مختلف ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اپنی انفرادیت کھو بیٹھا ہے۔ رئیس اپنی گم ہوتی ہوئی فردیت اور شناخت کی تلاش میں ہے جو کسی تعلق یا تقاضے کی قید میں نہ ہو جب کہ انجلی بھی عورت کی حیثیت سے اپنی شناخت چاہتی ہے اور اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے:

”یک بارگی انجلی کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر رئیس سے لپٹ جائے او پھوٹ پھوٹ کر روئے، اس نے کہے کہ تم صرف ایک بے نام رشتے کی تلاش میں ہو اور میں ایسے ہی بے نام رشتوں میں جیون بارہی ہوں لیکن دکھی ہوں، بے چین

ہوں، میں ایک ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں جسے میں
شناخت کر سکوں، جس کے ذریعے اپنی شناخت حاصل کر
سکوں۔“ (۹)

اکیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے انسان کی زندگی کو آسان تو بنایا ہے مگر اسی
ترقی کے ساتھ اخلاقی زوال اور انسانی اقدار کی متزلزل بھی سامنے آئی ہے۔ لوگ اپنی ذاتی خواہشات اور مفادات کی
تعمیل کے لیے قدرتی حدود اور معاشرتی اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ادب میں یہ سائنس کے جنون اور اخلاقی
بحران کو اکثر انسانی نفسیات اور معاشرتی تضادات کی عکاسی کے لیے پیش کیا جاتا ہے، جہاں ترقی جسمانی سہولت تو دیتی
ہے مگر انسانیت کی روحانی اور اخلاقی قدر کھو جاتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ "صدی کو الوداع کہتے ہوئے"
اکیسویں صدی میں موجود سائنسی جنون اور اخلاقی زوال کو نمایاں کرتا ہے۔ کہانی میں ایک ماں اپنی کم سن بیٹی کو
ہارمونز کے انجیکشن دے کر وقت سے پہلے بڑا کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اسے ایک ماڈل بنا سکے۔ باپ ابتدا میں مخالفت
کرتا ہے مگر آخر کار ہار مان لیتا ہے۔ یوں بچے والدین کی خواہشات کی بھینٹ چڑھ کر اپنا بچپن اور معصومیت کھو دیتے
ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”ریا کی وہ خون آ نکھیں۔۔۔۔۔ وہ مضبوط نہیں، وہ بہت
کمزور ہیں۔ لمحے میں خود کشی جیسے فیصلوں میں زندگی کا
مفہوم ڈھونڈنے والی۔ شخصی تشدد کا شکار۔۔۔“ (۱۰)

ایڈیٹس کمپلیکس نفسیات کا ایک مشہور نظریہ ہے جو سگمنڈ فرائیڈ نے پیش کیا۔ اس کے مطابق بچے میں
ابتدائی عمر میں والدین کے ساتھ تعلقات کے باعث مخصوص نفسیاتی کشش پیدا ہوتی ہے، خاص طور پر بیٹے میں ماں
کے لیے محبت اور باپ کے لیے حسد یا مقابلے کا احساس۔ یہ کمپلیکس بچے کی شخصیت، جذبات اور بعد کے تعلقات پر
گہرے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ ادب میں ایڈیٹس کمپلیکس کو اکثر کرداروں کی داخلی کشش، محرومی اور نفسیاتی تناؤ
کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جہاں والدین اور بچے کے تعلقات کہانی کے اہم عنصر کے طور پر سامنے
آتے ہیں۔ شہناز شورو کا افسانہ "نفسیاتی عدم توازن کا کرب" ایک شادی شدہ جوڑے کے ذہنی اور جذباتی اذیت کی
عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے کی راوی شوہر کی بیوی شہناز ہے۔ کہانی ایک ایسے گھرانے کے گرد گھومتی ہے جہاں
میاں، بیوی اور بیوہ ساس اکٹھے رہتے ہیں۔ اس گھر میں ساس اپنے بیٹے کی حد سے زیادہ دیکھ بھال کرتی ہے جب کہ بیٹا

بھی ہر وقت ماں کی خدمت اور تیمارداری میں مصروف رہتا ہے۔ شوہر کی یہ عادت اس کی بیوی کو ناگوار گزرتی ہے، جس کے نتیجے میں ان کی ازدواجی زندگی شدید طور پر متاثر ہونے لگتی ہے۔ جب شوہر دفتر سے واپسی پر بیوی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہے تو ماں کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے پاس روک لیتی ہے۔ وہ زیادہ تر وقت والدہ کے ساتھ گزارتا ہے، وہیں کھاتا پیتا اور رہتا ہے۔ اس کردار کی نفسیاتی کیفیت کے تانے بانے ایڈی پس کمپلیکس سے جاملتے ہیں۔ رؤف نیازی اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

”افسانہ ”نفسیاتی عدم توازن کا کرب Oedipus complex کی کہانی ہے۔ بیٹا بیشتر ماں کے پہلو میں ہمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی منکوحہ کے لیے Non erotic اور Passive ہی رہتا ہے۔ اس کی بیوی شبانہ لے دے کر اس سے ایک بیٹا ہی پیدا کرتی ہے اور پندرہ سولہ سال اپنی ناآسودگی کی غلش کے ساتھ کاٹتی ہے۔“^(۱۱)

ذہنی صحت کے موضوع پر لکھے گئے یہ اردو افسانے محض ادبی تخلیقات نہیں، بلکہ ہمارے عہد کی سب سے بڑی سچائی کی دستاویز ہیں۔ یہ افسانے ہمیں بتاتے ہیں کہ ترقی کی اس دوڑ میں ہم نے مادی سہولتیں تو حاصل کر لیں لیکن اپنا ذہنی سکون کھو دیا۔ یہ افسانے اس خاموش وبا کی آواز بن گئے ہیں جو ہمارے معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی ہے لیکن جس کے بارے میں بات کرنا آج بھی عیب سمجھا جاتا ہے۔ معاصر اردو افسانہ نگاروں نے ذہنی بیماریوں کو موضوع بنا کر ایک اہم سماجی ذمہ داری نبھائی ہے۔ جنوبی ایشیائی معاشروں میں ذہنی صحت کے مسائل کو بد نما داغ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ذہنی بیماریوں کو ”پاگل پن“ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں اور مریضوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب نے اس خاموشی کو توڑا ہے۔ افسانہ نگاروں نے دکھایا ہے کہ ذہنی بیماریاں حقیقی ہیں۔ یہ کمزوری کی نشانی نہیں بلکہ ایک طبی مسئلہ ہیں جس کا علاج ممکن ہے۔ ان افسانوں نے سماج میں بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ افسانے ہمیں یہ بھی سکھاتے ہیں کہ ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ذہنی کرب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شاید ہمارے گھر میں، ہمارے دفتر میں یا ہماری گلی میں کوئی ایسا شخص ہو جو خاموشی سے اپنی جنگ لڑ رہا ہو۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے، اس کی بات سننی چاہیے اور اسے یہ احساس دلانا چاہیے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ یہ افسانے ہمدردی اور انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ جس طرح پریم چند نے اپنے دور کے کسان کی تکلیف کو بیان کیا، منٹو

نے تقسیم کے زخموں کو الفاظ دیے، اسی طرح آج کے افسانہ نگار نے اپنے دور کے انسان کے ذہنی کرب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان افسانوں کا مطالعہ اس حقیقت کو مستحکم کرتا ہے کہ ادب صرف ماضی کی داستانیں نہیں سناتا، بلکہ حال کی حقیقتوں کو بھی بیان کرتا ہے اور مستقبل کے لیے راہ بھی دکھاتا ہے۔ آنے والے برسوں میں جیسے جیسے ذہنی صحت کے مسائل بڑھتے جائیں گے، ادیبوں کی یہ ذمہ داری بھی بڑھتی جائے گی۔

ذہنی صحت کے موضوع پر لکھے گئے یہ افسانے ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ سماجی اور نفسیاتی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ افسانے ایک خاموش انقلاب کی شروعات ہیں، ایک ایسے انقلاب کی جو لوگوں کی سوچ بدلے گا، معاشرتی رویوں کو تبدیل کرے گا اور ذہنی صحت کو اتنی ہی اہمیت دے گا جتنی جسمانی صحت کو دی جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱. ابوالکلام قاسمی۔ نظریاتی تنقید۔ ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء۔ ص ۱۳۰
۲. صغیر افرامیم۔ اردو فکشن: تنقید اور تجزیہ۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء۔ ص ۲۳۱
۳. محمد حمید شاہد۔ باقی عمر اضافی ہے، مشمولہ، سانس لینے میں درد ہوتا ہے۔ جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۹ء۔ ص ۲۸
۴. نیز اقبال علوی۔ جہان رنگ و بو۔ لاہور: ملٹی میڈیا انٹیرز، ۲۰۰۳ء۔ ص ۱
۵. محمد حمید شاہد۔ کونڈے میں کچلاک، مشمولہ، سانس لینے میں درد ہوتا ہے۔ ص ۲۱
۶. خالد سعید۔ سوال کے ہاتھ۔ ملتان: بیکن ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔ ص ۲۰
۷. عذرا عباس۔ سڑک پار کرنے سے پہلے، مشمولہ، راستے مجھے بلاتے ہیں۔ کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۱ء۔ ص ۹
۸. مبین مرزا۔ خوف کے آسمان تلے۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء۔ ص ۱۰۶
۹. ایضاً۔ ص ۳۸
۱۰. مشرف عالم ذوقی۔ صدی کو الوداع کہتے ہوئے۔ دہلی: ساشا پبلیکیشنز، ۲۰۰۰ء۔ ص ۲۳
۱۱. شہناز شورو۔ زوال دکھ۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۵